دعوۃ القرآن

تفسیر سورۂ فاتحہ

از:

مولانا شمس پیرزادہؒ

اِدارہ دعوۃُ القرآن

۵۹۔محمد علی روڈ، ممبئی نمبر ۴۰۰۰۰۳ ☆ فون: ۲۳۴۶۵۰۰۵

آٹھواں ایڈیشن: ۲۰۰۰

ستمبر ۲۰۱۲ء

قیمت: ۸/ روپئے

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

پیش لفظ

از : محمد صدیق قریشی ۔ سکریٹری ادارہ دعوۃ القرآن

مسلمانوں میں ایک بہت بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ’’ قرآن مجید کا سمجھنا بہت مشکل ہے جو عام آدمی کے بس کا نہیں ، بلکہ صرف علماء کا کام ہے ۔ اور عام آدمی کے لئے صرف اس کو بے سوچ سمجھے تلاوت کر لینا ہی کافی ہے ۔ اور دین کا علم حاصل کرنے کے لئے دینی کتابیں پڑھ لی جائیں تو مقصد پورا ہو جاتا ہے ‘‘ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمان ایمان ویقین کی اس کیفیت اور عشق وجذبہ کی اُس حرارت سے محروم ہو گیا۔ جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس مقصد عظیم کے پیش نظر ادارہ، قرآن کریم کی تفسیر ’’ دعوۃ القرآن ‘‘ پانچ زبانوں اردو، مراٹھی، گجراتی، ہندی اور انگریزی میں تین تین جلدوں میں شائع کر رہا ہے۔ اب تک ہر زبان میں اس کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں ۔ اس تفسیر کی جو قدر دانی ہو رہی ہے ہم اللہ رب العزت کا فضل خاص سمجھتے ہیں اور اس کی اشاعت کے کام میں مزید فضل کے امیدوار ہیں ۔

اس تفسیر کے مؤلف مولانا شمس پیرزادہ ہیں جن کا ۴/ جولائی ۱۹۹۹ء کو انتقال ہو گیا اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّـا اِلَیْـہِ رَاجِعُون ، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور آخرت میں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین

عام طور پر مسلمان نمازوں میں آخری پارہ کی چھوٹی چھوٹی سورتیں تلاوت کرتے ہیں اس لئے تفسیر پارہ عم کو علٰیحدہ سے چھپوایا گیا تھا جو دستی کتابت کے ساتھ ساتھ سائز میں بھی بڑا تھا۔ اب کمپیوٹر کی خوبصورت کتابت (D.T.P.) کے ساتھ ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پارۂ عم کے شروع میں سورۂ فاتحہ چھپوانے کا عام رواج رہا ہے لیکن مولانا مرحوم اس کو قرآن مجید کی ترتیب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے تفسیر سورۂ فاتحہ کو بھی علٰیحدہ پمفلٹ کی شکل میں چھپوایا گیا تھا۔

(۱) الفاتحه

یہ سورہ نبوت کے ابتدائی زمانہ میں مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کی سات آیتیں ہیں۔ اس سورہ کی حیثیت دیباچۂ قرآن کی ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ فاتحہ یعنی افتتاحی سورہ ہے۔ اس کا اعجاز یہ ہے کہ نہایت مختصر ہونے کے باوجود اس میں پورے قرآن کا لبِّ لباب موجود ہے۔ اسی لئے اسے ام القرآن کہا گیا ہے۔ قرآن کی دعوت کے بنیادی نکات توحید، آخرت اور رسالت کو نہایت خوبی کے ساتھ اس میں سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت، ربوبیت، اور الوہیت کی صفات بیان ہوئی ہیں جو توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ روزِ جزاء کا مالک ہونا توحید اور آخرت دونوں پر دلالت کرتا ہے اور انعام یافتہ لوگوں کا راستہ سلسلۂ رسالت پر دلالت کرتا ہے۔

اس سورہ کے معانی پر غور کرنے سے حقائق و معارف کے بے شمار پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

یہ سورہ دعائیہ پیرایہ میں ہے اور دعا بھی ایسی جو ایک سلیم الفطرت انسان کے ضمیر کی آواز اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ترانۂ حمد ہے۔ گویا اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ان الفاظ میں اس کے حضور دعا گو ہو۔ کلام کا یہ انداز نہایت لطیف ہے، لیکن جو لوگ لطافت سے نا آشنا ہوتے ہیں وہ یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو ’’ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے ‘‘ کہنے کا کیا مطلب؟ حالانکہ یہاں بلاغت کا پہلو نہایت روشن ہے اور فحوائے کلام سے بخوبی واضح ہے کہ خالقِ کائنات اپنے بندوں کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ وہ اس کی حمد و ثناء اس آغاز کے ساتھ اور ان الفاظ میں کریں اور ان کلمات کے ساتھ اس کے حضور دعا گو ہوں۔ اس طرح بندوں کو نہ صرف بندگی کی تعلیم دی گئی ہے بلکہ آدابِ بندگی بھی سکھائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے یہود و نصاریٰ کو اسلام کی شاہراہ دکھائی تھی تاکہ وہ خود اس پر چلیں اور دنیا والوں کو اس پر چلنے کی دعوت دیں۔ لیکن انہوں نے کجروی اختیار کرکے اپنے اوپر بھی راہِ حق گم کر دی اور

دنیا والوں کو بھی تاریکی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ یہ دعا اس تاریکی سے نکلنے کی دعا ہے، چنانچہ اس کی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی۔

بندہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا کے جواب میں پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، کہ تلاش جس کی ہے وہ راہِ ہدایت تیرے سامنے روشن ہے۔ اب اللہ کا نام لے اور اس راہ پر گامزن ہو جا۔

سورۂ فاتحہ اور نماز نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ لازماً پڑھی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کی طرف متوجہ ہو کر ہر ہر آیت کا جواب عنایت فرماتا ہے۔ حدیث قدسی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

’’ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے طلب کیا۔ چنانچہ بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ جب بندہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب بندہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ۔ جب بندہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو اس نے طلب کیا، اور جب بندہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو اس نے مجھ سے طلب کیا۔‘‘ (مسلم نسائی)

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۱

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۲

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۳

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۴

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۵

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۶

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۷

(۱) سورة الفاتحة

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔[۱]

۱ حمد[۲] اللہ ہی[۳] کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب[۴] ہے۔

۲ رحمٰن ورحیم[۵] ہے۔

۳ روزِ جزا کا مالک[۶] ہے۔

۴ ہم تیری ہی عبادت[۷] کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد[۸] مانگتے ہیں۔

۵ ہمیں سیدھے راستے[۹] کی ہدایت بخش۔

۶ ان لوگوں کے راستے کی جنہیں تو نے انعام[۱۰] سے نواز۔

۷ جو نہ مغضوب[۱۱] ہوئے اور نہ گمراہ۔[۱۲]

تفسیر

۱۔ یہ قرآن کی افتتاحی آیت ہے۔اور ہر سورہ کا آغاز بجز سورۂ توبہ کے اسی آیت سے ہوا ہے۔ گویا اس کی حیثیت تمہید کی سی ہے۔ یہ مختصر، جامع، معنیٰ خیز اور نہایت ہی بابرکت کلمات ہیں، جس میں خدا کے متبرک نام اور اس کی صفتِ رحمت کا ذکر ہے۔ان ابتدائی کلمات ہی پر غور کرنے سے معرفت الٰہی (خدا کی صحیح پہچان) کے دروازے کھلنے لگتے ہیں اور انسان کے اندر اس کی صحیح پہچان کا پیدا ہو جانا اسکی رحمت کا فیضان ہے۔

کسی بھی اچھے کام کو شروع کرنے کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور بہتر کلمات کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔یہی وجہ ہے کہ ہر اچھے کام کا آغاز حتیٰ کہ کھانے پینے کی ابتداء بھی ان کلمات (بسم اللہ) سے کرنا اسلامی تہذیب کا شعار ہے۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز اِقْرَأ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) سے ہوا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بسم اللہ نازل کر کے بندہ کی رہنمائی فرمائی کہ وہ اس حکم کی تعمیل ان الفاظ میں کرے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تورات میں یہ پشنگوئی موجود ہے کہ آپ اللہ کا کلام، اللہ کا نام لیکر پیش کرینگے۔چنانچہ تورات کی کتاب استثنا میں ہے۔

''میں انہیں کے لئے انہیں کے بھائیوں میں سے تیری (موسیٰ) کی مانند ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اسکے منہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اُسے حکم دونگا، وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری ان

باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں اُنکا حساب اس سے لونگا۔'' (استثناء ۱۸:۱۸، ۱۹)

یہ آیت دعا کی حیثیت رکھتی ہے۔گویا بندہ کتابِ الٰہی کا آغاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ تیری توفیق ہی پر منحصر ہے۔اور ہدایت کی راہ مجھ پر اسی صورت میں روشن ہوسکتی ہے اور حقائق و معارف کے اس اتھاہ سمندر میں علم و بصیرت کے موتی، میں اسی صورت میں چن سکتا ہوں جبکہ تو میری دستگیری فرمائے۔''بسم اللہ'' کی ''ب'' قرآن کا پہلا حرف ہے اور عربی قاعدے کے مطابق یہ بائے استعانت ہے۔گویا قرآن کا پہلا حرف ہی قاری کی یہ حیثیت متعین کر دیتا ہے کہ وہ ایک عاجز بندہ ہے جو اللہ کی مدد کا ہر وقت محتاج ہے۔اور اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت کا دروازہ ان ہی لوگوں پر کھولتا ہے، جو خدا کی کتاب کا مطالعہ خدا بنکر نہیں کرتے، بلکہ بندہ کی حیثیت سے جویائے حق اور طالب ہدایت بن کر کرتے ہیں۔

۲۔ متن میں حمد کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ تعریف اور شکر دونوں کے ہیں۔''تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ خوبیوں والا ہے اور کمالات سے متصف ہے۔وہ عیوب اور کمزوریوں سے نہ صرف پاک اور منزّہ ہے بلکہ اس کے لئے حسن ہی حسن اور جمال ہی جمال ہے۔اور وہ سرچشمۂ خیر و برکت ہے۔اسکے یہ فضائل و کمالات ذاتی اور مستقل ہیں اور وہ تمام صفات حسنہ میں تنہا اور یکتا ہے۔اس لئے تنہا وہی لائق ستائش ہے اور اسی کے گن گائے جانے چاہئیں، اس کے سوا کوئی ہستی نہیں ہے جو بالذات اپنے اندر خوبیاں رکھتی ہو۔اس لئے کائنات میں ایک سے زیادہ خداؤں کے تصور کے لئے سرے سے کوئی بنیاد موجود ہی نہیں ہے۔اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو خدا سمجھ کر اس کے گن گانے اور اس کی مالا جپنے کا سوال پیدا

ہی کہاں ہوتا ہے؟

اور '' شکر اللہ ہی کے لئے ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان جن بیشمار نعمتوں سے نوازا گیا ہے وہ سب اللہ ہی کی بخشش اور دین ہیں۔ مثلاً زندگی جیسی عظیم نعمت، خورد ونوش کا اعلیٰ ذوق اور اس کے مطابق رزق کا سامان، اولاد جیسی آنکھوں کی ٹھنڈک، عقل وشعور اور علم کی دولت اور دیگر ظاہری اور باطنی نعمتیں سب اسی کی عطا کردہ ہیں۔ اس لئے شکر کا مستحق بھی تنہا وہی ہے۔ اسی کی نعمتوں کا اعتراف کرنا چاہیئے اور اسی کا سپاس گذار اور شکر گذار بنکر رہنا چاہیئے۔

شکر کا یہ جذبہ دین کی اساس ہے اور اسی بنیاد پر خالقِ کائنات سے انسان کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے۔ گویا یہ ہدایت کی کلید ہے۔ اسی لئے قرآن انسان کی ذہنی وفکری تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے اور وہ اللہ تعالیٰ کا گرویدہ بن جائے۔

۳؎ اللہ اس ہستی کا نام ہے جو تمام کائنات کا خالق ہے۔ یہ نام ہمیشہ سے اس کیلئے خاص رہا ہے، اس لفظ سے نہ جمع کا صیغہ بنایا جاسکتا ہے اور نہ مونث کا۔ عربی میں اس کے معنیٰ معبودِ حقیقی کے ہیں۔ دوسری زبانوں میں اس کا ٹھیک ٹھیک بدل ملنا مشکل ہے۔ اردو میں خدا اور انگریزی میں (God) کے الفاظ عام طور سے خالق کائنات کیلئے مستعمل ہیں۔ لیکن خدا سے جمع کا صیغہ خداؤں اور خداوندان بنایا جاتا ہے اور (God) دیوی دیوتاؤں کیلئے بولا جاتا ہے، چنانچہ اس کا مؤنث (Goddess) آتا ہے جس کے معنی دیوی کے ہیں۔ چنانچہ زہرہ سیارہ کو (Goddess Venus) کہا جاتا ہے، نیز عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث میں

حضرت عیسیٰؑ کو (God the Son) کا خطاب دیا گیا ہے۔

(The Oxford Eng. Dictionary Vol.IV P.268.271)

مراٹھی میں ایشور اور پرمیشور کے الفاظ خدائے تعالیٰ (Supreme Being) کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ شیو(शिव) اور وشنو (विष्णु) کے القاب بھی ہیں۔ لفظ ایشور (ईश) اور (वर) سے مرکب ہے۔ (ईश) کے معنی مالک اور حاکم کے ہیں اور (वर) کے معنی برتر۔ اس طرح (ईशवर) کے معنی ہوئے خدائے برتر، لیکن اس کا مؤنث ایشوری (ईशवरी) آتا ہے، جو دیوی کیلئے بولا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو (Moles Worth's Marathi Eng Dictionary P. 84) اسی طرح پرمیشور (परम) اور (ईशवर) سے مرکب ہے۔ (परम) کے معنی اعلیٰ کے ہیں اور پرمیشور کے معنی اعلیٰ ایشور کے۔ ایشور اور پرمیشور دونوں الفاظ کے استعمالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اگرچہ خالق کائنات کیلئے استعمال ہوتے ہیں لیکن اس کیلئے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ دیوی دیوتاؤں کے لئے بطور صفت یا لقب انکا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح بھگوان (भगवान) کا اسم بھی خدا کیلئے خاص نہیں ہے، بلکہ بطور لقب یا صفت دیویوں کیلئے اس کا استعمال عام ہے۔ مثلاً بھگوان واسودیو (भगवान वासुदेव) اسی طرح وشنو اور شیو کو بھی بھگوان کہا جاتا ہے، لہٰذا یہ اسماء قرآن کے اسم '' اللہ '' کا بدل نہیں ہوسکتے، جو خالق کائنات کیلئے بالکل مخصوص ہے اور ہر قسم کے احتمالات سے بالکل پاک ہے۔ یہ لفظ واحد ہے اسکی کوئی جمع نہیں آتی۔ نیز اس کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ نام زبان پر آتے ہی ذہن اس کی صفاتِ کمالیہ کی طرف منتقل ہونے لگتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں جہاں کہیں اسم اللہ آیا ہے ہم نے ترجمہ میں بھی لفظ اللہ ہی رکھا ہے۔

اسم اللہ قرآن میں ۲۶۹۷ بار آیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نام کی معرفت کتنی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ قرآن میں پیش کی گئی ہے۔

۴؎ رب کے معنی ہیں پرورش کرنے والا اور مالک و آقا۔ اللہ کے کائنات کا رب ہونے کا

مطلب یہ ہے کہ وہ کائنات کا صرف خالق و پروردگار ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مالک اور آقا بھی ہے۔ سارے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور کائنات کا سارا انتظام وہی تنہا کر رہا ہے۔ ساری مخلوق اسکے سامنے عاجز ہے اور سب اس کے بے اختیار اور بے بس بندے ہیں۔ حقیقی حاکم اور فرمانروا بھی وہی ہے کیونکہ مالک اور آقا ہونے کا یہ لازمی مفہوم ہے۔ اس کی یہ ربوبیت اس جہاں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ستاروں سے آگے جو اور جہاں ہیں وہاں بھی اس کی ربوبیت کا ظہور ہے۔ غرض انسان اور حیوان، جن اور فرشتے دنیا اور آخرت سب کا پروردگار اور مالک وہی ہے۔

یہاں یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ فرمایا ہے۔ رَبُّ الْمُسْلِمِيْنَ نہیں فرمایا۔ کیونکہ اللہ کسی ایک گروہ، ایک طبقہ اور ایک فرقہ کا رب نہیں ہے بلکہ بلاتفریق پوری نوع انسانی کا رب ہے۔

۵؎ رحمٰن و رحیم دونوں الفاظ رحمت سے مشتق ہیں اور اللہ کی صفت ہیں۔ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بے انتہا مہربان، اس میں جوشِ رحمت کا پہلو غالب ہے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کی تخلیق اس کے غضب کے نتیجہ میں نہیں، بلکہ جوشِ رحمت کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔ اور اس کی یہ رحمت نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہے جن سے انسانوں کا کوئی گروہ یا مخصوص فرقہ یا مخصوص قوم نہیں، بلکہ پوری نوع انسانی فیضیاب ہو رہی ہے۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ تمام مخلوقات اور پوری کائنات پر اس کی رحمت چھائی ہوئی ہے۔ اور ہمہ گیر رحمت کے اس مفہوم کے پیش نظر یہ نام اللہ کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ اور الرحمٰن کے نام سے اسی کو پکارا جاتا ہے۔ گویا اس لفظ کی حیثیت اسمِ علم کی سی ہے اس لئے خدا کی صفتِ رحمت کو نمایاں کرنے کے لئے الرحیم کا اضافہ نہایت موزوں ہوا۔

رحیم اسمِ صفت ہے اور اس پہلو کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کی رحمت مستقل اور دائمی ہے۔ اس سے

اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انسان کی تخلیق نہ صرف اس کی رحمت کے جوش میں آنے سے ہوئی بلکہ وہ اس پر برابر اپنی رحمت کی بارش کر رہا ہے، اور جو لوگ اس کے راستہ پر چلیں گے انہیں وہ ابدی طور پر اپنی رحمت سے نوازے گا۔

واضح رہے کہ رحیم کو رام کے مترادف سمجھنا صحیح نہیں، کیونکہ رحیم اللہ وَحْدَهٗ کی صفت ہے جب کہ رام ایک مذہبی پیشوا کا نام ہے۔

۶؎ یعنی قیامت کا دن، جبکہ اللہ عدالت برپا کرے گا اور تمام اگلے پچھلے انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، تاکہ اس کے حضور پیش ہو کر اپنے کارنامۂ زندگی کا حساب دیں اور اپنے اچھے یا برے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائیں۔

عدل و انصاف اللہ کی صفت ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ بندوں کے درمیان انصاف کیا جائے۔ اس کے وفادار بندے انعام سے نوازے جائیں اور سرکشوں کو کڑی سزا دی جائے۔

جزا و سزا کا یہ تصور عقیدۂ تناسخ سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ عقیدۂ تناسخ ایک چکر ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہا۔ اس عقیدہ کی رُو سے یہ دنیا دار العذاب ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے، فرمانروائے کائنات کی طرف سے عدالت کے برپا کئے جانے، انسانی اعمال کے ریکارڈ پیش کئے جانے اور اللہ کی طرف سے ابدی انعام یا سزا پانے کے تصور سے بالکل خالی ہے۔

عدل کا تصور انسان کی سرشت میں موجود ہے۔ اسی بنا پر انسان عدالتیں قائم کرتا ہے لہٰذا فرمانروائے کائنات کا ایک دن سب کو جمع کر کے عدالت برپا کرنا کوئی غیر معقول بات نہیں ہے، بلکہ عقل کے عین مطابق اور فطرت سے بالکل ہم آہنگ اور اس کا کھلا تقاضا ہے۔

قرآن میں جابجا اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت اور صفتِ عدل و حکمت سے آخرت پر استدلال کیا

گیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش اور ربوبیت کا جو سامان کیا ہے اس کو انسان جب کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو ربوبیت کا تقاضا ابھر کر سامنے آجاتا ہے، کہ جزا و سزا کا ایک دن ہونا چاہیئے۔تاکہ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ اور بدکاروں کو ان کے کئے کی منصفانہ سزا ملے۔قرآن کہتا ہے کہ جس ہستی نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کو مضبوط چھت بنایا، تمہاری روشنی کے لئے سورج اور چاند چمکائے، تمہارے جمالیاتی ذوق کے لئے ستاروں کی پررونق بزم سجائی، ہوا کو تمہاری خدمت میں لگایا اور بارش کے ذریعہ پانی کا حیرت انگیز انتظام کیا۔قسم قسم کے پھل پھول اور میوے پیدا کئے، نباتات اور اناج پیدا کرکے تمہارے رزق کا سامان مہیا کیا، جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کیا اور پوشش اور زیبائش کے لئے لباس مہیا کیا۔غرضیکہ جس نے اس بزم کائنات کو سجا کر تم پر اپنی نعمتوں کی بارش کی، اس ہستی کے بارے میں کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اس نے یہ کارخانہ محض کھیل کے طور پر بنایا ہے اور اس کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے اور کیا ان نعمتوں کے سلسلے میں تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ جس کی باز پرس ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ جزا و سزا سے انکار وہی کر سکتا ہے جو خواہش نفس سے مغلوب ہو گیا ہو، کیونکہ خواہشات کا غلبہ اسے اس بات پر آمادہ نہیں کرتا کہ وہ ذمہ دارانہ زندگی گزارے، بلکہ اس کی نظروں میں ایسی زندگی کو خوش آئند بنا کر پیش کرتا ہے جس میں کسی کے حضور جواب دہی کا تصور نہ ہو اور اس پر نہ ذمہ داریوں کا بوجھ ہو اور نہ اس کی آزادی محدود کر دی گئی ہو۔قرآن کہتا ہے کہ ہر انسان ذمہ دار ہے اور اس سے لازماً اس کے اعمال کے بارے میں باز پرس ہونی ہے اور فیصلہ کا ایک دن مقرر ہے۔جس نے اپنی ذمہ داریاں پوری کی ہونگی، وہ کامیاب ہوگا اور جس نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا وہ ناکام رہے گا۔

ذمہ داری کا یہ احساس اور آخرت کا یقین آدمی کو خدا اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی پر آمادہ کرتا

ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔گویا عقیدۂ آخرت کی برکتیں اس دنیا ہی میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔بشرطیکہ آدمی اس کو شعوری طور پر اور حقیقت سمجھ کر قبول کرے۔

۷ عبادت عبد سے ہے جس کے معنیٰ بندے کے ہیں اور عبادت کے معنیٰ ہیں بندگی۔اس کے لغوی معنیٰ میں اطاعت بھی شامل ہے جو خضوع کے ساتھ ہو۔چنانچہ لسان العرب میں ہے: **وَمعنی العبادة فی اللغة الطاعة مع الخضوع** (لسان العرب ج ۳ ص ۲۷۳) عبادت کی روح انتہائی خشوع و خضوع اور عاجزی و فروتنی کا اظہار ہے۔پرستش اور اس کی مختلف شکلیں مثلاً قیام، رکوع، سجدہ، نماز، طواف، دعا، استعاذہ، فریاد اور حاجت روائی کے لئے پکارنا، ذکر و تسبیح، گن گانا اور نام جپنا سب عبادات ہیں۔

قرآن میں عبادت کا لفظ ایک جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، جو پرستش، بندگی اور بے قید و غیر مشروط اطاعت، (جو خضوع کے ساتھ ہو) کے مفہوم پر مشتمل ہے۔البتہ چونکہ پرستش اُن کا اولین اور متبادل مفہوم ہے اس لئے موقع کی مناسبت سے یہ لفظ صرف پرستش کے لئے استعمال ہوتا ہے۔یہاں اس لفظ کا جامع مفہوم ہی مراد ہے۔

عبادت اللہ کے لئے خاص ہے کیونکہ لائقِ عبادت اسی کی ذات ہے۔ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، خواہ پتھر ہوں یا درخت، سورج ہو یا ستارے، انسان ہوں یا جن اور انبیاء ہوں یا فرشتے۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ کہف نوٹ ۱۳۵)

۸ حقیقی مددگار اللہ ہی ہے، اس لئے مدد صرف اسی سے طلب کرنا چاہیئے، خواہ مدد عبادت کے معاملہ میں مطلوب ہو یا کسی اور معاملہ میں، اس سے یہ بات واضح ہے کہ کسی پیغمبر، ولی، جن، فرشتہ، یا دیوی دیوتا کو مدد کے لئے پکارنا ہرگز روا نہیں، اس لئے کہ اللہ کے سوا کوئی مشکل کشا اور حاجت روا

نہیں ہے۔

یہاں بندہ خاص طور سے عبادت کے معاملہ میں اللہ سے مدد کا طالب ہے کیونکہ اس کی توفیق کے بغیر انسان اس کی عبادت کی سعادت حاصل نہیں کرسکتا۔

۹ سیدھے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جو سیدھا اللہ تک پہنچتا ہے۔اور جس پر چل کر آدمی منزل مقصود کو پہنچ جاتا ہے اور جو حقیقی فوز وفلاح کا ضامن اور رضائے الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔ یہ راستہ اسلام اور صرف اسلام کا ہے۔جس طرح دو نقطوں کے درمیان صرف ایک ہی خط مستقیم کھینچ سکتے ہیں۔اسی طرح اللہ تک پہنچنے کی واحد راہ یہی اسلام کی صراط مستقیم ہے۔اس سے خود بخود اس گمراہ کن نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ تمام راستے اللہ تک پہنچتے ہیں۔لہٰذا آدمی جس راہ پر بھی چل پڑے،خدا تک رسائی ہوجائے گی۔یہ غلط قسم کی رواداری ہے اور قرآن انسان کو رواداری کے اس پُرفریب تصوّر میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔

اسلام کو شاہراہ سے تعبیر کرنے میں دینِ حقیقی کا تصور بھی مضمر ہے۔ یعنی یہ دین ''**مذہبی مراسم کا مجموعہ**''نہیں ہے بلکہ ایک طریق زندگی **(Way of Life)** ہے،جس پر گامزن ہوکر اور عملی جدوجہد کرکے ہی انسان کامیابی کی منزل کو پہنچ سکتا ہے۔

۱۰ یعنی ہم حقیقی انعام کے طالب ہیں اور تیرے حضور اس کی درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ہم پر ہدایت وشریعت کی راہ کھول دے اور اپنے فیض اور اپنی خوشنودی سے ہمیں نواز۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقیقی انعام سے انبیاء،صدیقین،شہداء اور صالحین کو نوازتا رہا ہے۔یہ دعا اسی انعام یافتہ گروہ کی راہ پر چلانے کے لئے ہے۔یہیں سے رسالت پر ایمان لانے کی ضرورت بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔اللہ کے راستے کو معلوم کرنے کا انسان کے پاس کیا ذریعہ ہے؟انسان اپنی عقل

سے اس کے راستے،اس کی عبادت کے طور طریقے اور اس کی پسند و ناپسند کا تعین نہیں کرسکتا،بلکہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے بتانے ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں۔اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف زبانوں اور ملکوں میں پیغمبر بھیجے۔

۱۱ اللہ کا غضب ان لوگوں پر ہوا،جنہوں نے اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو دل کی آمادگی کے ساتھ قبول نہیں کیا بلکہ محض رسمی طور پر قبول کیا۔اور خواہشات کے پیچھے پڑ کر شرعی احکام کی خلاف ورزی کی اور سرکشی کا رویہ اختیار کربیٹھے۔اس کی مثال یہود ہیں۔

۱۲ گمراہ وہ لوگ ہوئے جنہوں نے اللہ کے دین کی نعمت کو پایا لیکن غلو،بدعات،ترکِ دنیا،اور فلسفیانہ بحثوں کے چکر میں پڑ کر راہ راست سے بہت دور نکل گئے۔اس کی مثال نصاریٰ ہیں۔

یہاں یہود و نصاریٰ کی گمراہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ صراط مستقیم (دین حق) کو پانے کے بعد اسے گم کرنیکی یہ جیتی جاگتی اور نمایاں مثالیں ہیں۔اور اس سے مقصود امت مسلمہ کو متوجہ کرنا ہے کہ وہ ان گمراہ ملتوں کی سی روش اختیار نہ کرے۔رہے مشرک،کافر اور ملحد تو وہ پرلے درجہ کے گمراہ ہیں اور ان کی گمراہی محتاجِ بیان نہیں۔

اس سورہ کے ختم پر آمین کہنا مسنون ہے جس کے معنی ہیں قبول فرما۔

زیر اہتمام: محمد صدیق قریشی
Pixel Arts
Mobail: 9820790615
Printed at : Fatima Printers
Tilak Nagar , Saki Naka Mumbai 400070